دربارِ فرعون سے وابستہ جادوگروں کی قلب ماہیت کو دیکھ لیجیے:

قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هَٰذَا
لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ ○ يُرِيدُ أَن
يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُم
بِسِحْرِهِ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ○
قَالُوا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَابْعَثْ
فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ○
يَأْتُوكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيمٍ ○
فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ
مَّعْلُومٍ ○ وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُم
مُّجْتَمِعُونَ ○ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ
إِن كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ○ فَلَمَّا
جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا لِفِرْعَوْنَ أَئِنَّ
لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ○
قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ
الْمُقَرَّبِينَ ○ قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ
أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ ○ فَأَلْقَوْا
حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوا بِعِزَّةِ
فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ ○
فَأَلْقَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ
مَا يَأْفِكُونَ ○ فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ○
قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ○ رَبِّ
مُوسَىٰ وَهَارُونَ ○ قَالَ آمَنتُمْ لَهُ

فرعون اپنے گرد و پیش کے سرداروں سے بولا
یہ شخص یقیناً ایک ماہر جادوگر ہے اور چاہتا ہے
کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے
نکال دے اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو۔ انہوں نے
کہا اسے اور اس کے بھائی کو روک لیجیے اور شہروں
میں ہرکارے بھیج دیجیے کہ ہر ماہر جادوگر کو آپ کے
پاس لے آئیں۔ چنانچہ ایک مقررہ وقت پر جادوگر
اکٹھے کر لیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا کہ تم اجتماع میں
چلو گے شاید کہ ہم جادوگروں کے دین ہی پر رہ جائیں
اگر وہ غالب رہے۔ جب جادوگر میدان میں آئے
تو انہوں نے فرعون سے کہا ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم
غالب رہے اس نے کہا ہاں اور تم تو اسی وقت مقربین
میں شامل ہو جاؤ گے۔ موسیٰؑ نے کہا پھینکو جو تمہیں
پھینکنا ہے۔ انہوں نے فوراً اپنی رسیاں اور
لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے فرعون کے اقبال سے
ہی غالب رہیں گے۔ پھر موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا
تو یکایک وہ ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا
جا رہا تھا۔ اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے
میں گر پڑے اور بول اٹھے کہ مان گئے ہم رب العالمین
کو۔ موسیٰؑ اور ہارون کے رب کو۔ فرعون نے کہا
تم موسیٰؑ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت
دیتا۔ ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے

قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۥ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۡ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الشعراء-۴۳ تا ۵۱)۔

اچھا ابھی تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو سُولی چڑھا دوں گا۔ انہوں نے جواب دیا کچھ پروا نہیں ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا کیوں کہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں

غور کیجیے ان کی شخصیات کیسے بدل کر رہ گئیں۔ کتنا بڑا اصلاحی انقلاب آناً فاناً ان کے اندر برپا ہوگیا۔ کہاں ان کی سوچ کا یہ انداز کہ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ (ہمیں انعام تو یقیناً ملے گا اگر ہم غالب رہے) اور کہاں یہ بلندیٔ فکر کہ لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ (ہم تجھے ہرگز ترجیح نہیں دے سکتے ان روشن دلائل پر جو ہمارے پاس آچکے) اور پہلی نیازمندی کے مقابلے میں ذرا بعد کی جرأت ایمانی کے تیور دیکھیے۔ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (تو ہمارے خلاف جو بھی فیصلہ کرنا چاہے کرلے)۔

آج مغربی تاریخ دان حیران ہیں کہ باشندگانِ عرب جو بکریاں چرایا کرتے تھے قوموں اور ملکوں کے حکمران کیوں کر بن گئے۔ بادیہ نشین تمدن و حضارۃ کے رموز کیسے پا گئے اور انہیں فتح و نصرت کا کونسا گُر ہاتھ آگیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کی باجبروت حکومتوں کے تختے اُلٹنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں اور وہ راز بھی زیادہ دیر تک راز نہیں رہا بلکہ سرعیاں ہوچکا ہے۔ عربوں کی کایا پلٹ دینے والی چیز اکسیر ایمان تھی جس کے ذریعے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کی زندگیوں میں محیر العقول انقلاب پیدا کیا۔ اسی اکسیر کی بدولت ان کے حالات میں تغیر رونما ہوا، ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا پورا ڈھانچہ تبدیل ہوا۔ بتوں کے پوجنے والے خدا پرست بن گئے اور جاہلیت کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھانے والوں کے سینے نورِ ایمان سے منور ہو گئے۔

اقفالِ حیات کے لیے واحد کلید حیاتِ انسانی کا عظیم الشان قصر ہر طرف سے مقفل تھا اور اس کے دروا

ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ عقلِ انسانی مقفل تھی جسے حکماء و فلاسفر کھولنے سے عاجز تھے۔ ضمیرِ انسان مقفل تھا اور واعظین و مرشدین اس کا تالا توڑنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ دل و دماغ مقفل تھے جنہیں حوادثِ زمانہ کے تھپیڑے تک کھول نہ سکے تھے۔ مواہب وعطایا مقفل تھے اور کوئی تعلیم و تربیت ان پر اثر انداز نہ ہو رہی تھی۔ مدرسہ مقفل تھا جسے کھولنے پر اساتذہ و علماء قادر نہ تھے۔ خاندانی نظام مقفل تھا اور اس کے آگے مصلحین و مفکرین کی کوئی پیش نہ چلتی تھی۔ قصرِ حکومت مقفل تھا جسے مظلوم عوام محنت کش کسان اور غریب مزدور اپنی متحدہ کوشش سے کھول نہ سکتے تھے۔ دولت مندوں کے خزانے مقفل تھے اور ان کے قفل غریبوں کی بھوک اور عورتوں اور بچوں کی برہنگی توڑ نہ سکتی تھی۔ عظیم مصلحین نے بارہا کوشش کی کہ ان تالوں کو توڑ دیا جائے تاکہ انسانیت کو زندگی کی حقیقی مسرتوں سے ہمکنار کیا جاسکے مگر بارہا انہوں نے منہ کی کھائی۔

حیاتِ انسانی کی اس مشکل کو بڑے بڑے دارالحکومتوں میں حل نہ کیا جاسکا۔ عظیم الشان یونیورسٹیاں اور درسگاہیں اس سے عاجز آگئیں تو اللہ کی رحمت کو جوش آیا اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک چھوٹی سی غار میں فروکش انسانیت کے ایک عظیم محسن کے ہاتھ پر اس مشکل کو آسان کر دیا گیا۔ اور تمام اقفالِ حیات کی کلید ان کی خدمت میں پیش کر دی گئی۔ یعنی ایمان باللہ والرسول والیوم الآخر کی شاہ کلید جس نے ایک ایک قفلِ حیات کو کھول دیا۔

اس کلید نے عقلِ انسانی کا قفل کھول دیا اور وہ انفس و آفاق میں اللہ کی بے شمار نشانیاں دیکھنے کے قابل ہوگئی اور شرک و بت پرستی کی برائی کو محسوس کرنے لگی۔ اس نے خوابیدہ ضمیرِ انسانی کا قفل کھول دیا اور وہ بیدار ہو گیا اور شعور حقیقت سے بہرہ ور ہو کر خوب و ناخوب میں امتیاز کرنے لگا۔ اس نے ان دلوں کے قفل کھول دیے جو نہ کسی چیز سے عبرت پکڑتے تھے نہ زجر و توبیخ کا کوئی اثر ان پر ہوتا تھا اور نہ نرمی و رقت ان میں پیدا ہوتی تھی مگر ایمان باللہ کی کلید کے استعمال سے ان کے اندر خشوع و خضوع پیدا ہوا اور وہ حوادثِ روزگار سے عبرت پکڑنے لگے۔ کسی مظلوم کو دیکھتے تو اُن کے دل کے اندر ارتعاش پیدا ہو جاتا اور ضعیف و ناتواں پر نظر پڑتی تو جذباتِ رحم و شفقت سے مملو ہو جاتے۔ اس سے پہلے حیاتِ انسانی کا دامن اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں اور دیگر مواہب و قویٰ سے معمور تو تھا مگر یہ تمام استعدادیں مقفل تھیں۔ ایمان باللہ کی کلید نے یہ اعجاز دکھایا کہ انسان کی جملہ مخفی استعدادیں اجاگر کر دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کے چرانے والے

اقوام وملل کے پاسبان بن گئے۔ نیابت الٰہی سے ہمکنار ہو کر عالم پر حکمرانی کرنے لگے اور جو قبیلوں کے سردار تھے وہ ممالک و دول کی قیادت وسیادت پہ فائز ہو گئے۔ اس کلید نے درسگاہوں اور دانشکدوں کے قفل کھول دیئے اور دنیا کو علم کے شرف سے آگاہی نصیب ہوئی اور عالم و متعلم اور مربی و معلم کے فضل وتفوق پہ رشک کرنے لگی۔ گھر گھر تدریس و تعلیم کی مسند بچھ گئی اور ہر بچے بوڑھے اور نوجوان کے لیے زیورِ علم سے آراستہ ہونا ضروری ٹھہرا۔ اسی کلید نے عدل و انصاف کے مقفل ایوان تک اہلِ عالم کو رسائی بخشی چنانچہ حکام و قضاۃ عدل و انصاف اور پوری احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرنے لگے اور مظلوموں اور ستم کشوں کے دن پھر گئے اور ظلم وجور سے معمور خدا کی خدائی، رحمتِ الٰہی کا گہوارہ بن گئی۔ اس کلید کے ہاتھ لگنے سے پہلے خاندانی نظام تہ و بالا تھا۔ بیٹا باپ کے حقوق پہ دست درازی کر رہا تھا اور بھائی بھائیوں کو لوٹنے کے درپے تھا۔ مزید برآں خاندانی نظام کا یہ فساد معاشرہ تک متعدی ہو چکا تھا۔ آقا خادموں پر ستم توڑ رہے تھے اور بڑے چھوٹوں پہ۔ ان حالات میں ایمان باللہ کی کلید نے ہر ایک کو دوسرے کے حقوق یاد دلائے اور ان کا تحفظ کرنا سکھایا، باہمی رحمت و مؤدت پر تعلقات استوار کیے۔ خدا کا خوف اور آخرت کی فکر دلوں پہ مسلط کی اور اس حقیقت کا گہرا شعور بخشا کہ آدمیت، انسانیت کے احترام اور انسانیت کی خدمت کا نام ہے۔ معاشرتی زندگی کی چولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں انہیں پھر سے کس دیا اور معاشرہ میں عدل و اخوت کی روح دوڑا دی، خیر خواہی و ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ قوم کا سردار قوم کا خادم بن گیا اور امراء و اغنیاء نے اپنی دولت کا رُخ غرباء و مساکین اور محروم لوگوں کی طرف پھیر دیا۔

قصہ مختصر یہ کہ افرادِ معاشرہ کی اصلاح کے لیے جتنا مؤثر کردار ایمان ادا کرتا ہے اور کوئی چیز نہیں کرتی لہٰذا جس طرح کلیدِ ایمان سے سینکڑوں سال پہلے معاشرہ مبدل بہ اصلاح ہو گیا تھا اسی طرح دورِ جدید کے تمام مشکل مسائلِ حیات کو بھی ایمان کی بنیاد پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بات بالکل غلط ہے کہ جدید مسائلِ حیات کے لیے یہ قدیم کلید کارآمد نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ مسائل جدید ہیں اور نہ ان کے حل کے لیے کسی جدید کلید کی ضرورت ہے کیونکہ ؎

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

زندگی کے مسائل جو آج سے ہزاروں سال پہلے تھے وہی آج بھی فکر انسانی پر تسلط جمائے ہوئے

ہیں - فرق جو کچھ پڑا ہے وہ صرف یہ ہے کہ یہ مسائل نئے رنگ میں سامنے آئے ہیں۔ آج سے ہزاروں سال پہلے انسان کو امن کی ضرورت تھی اور آج بھی انسان اس کا بشدت ضرورت مند ہے۔ آفاتِ ارضی و سماوی، دکھ تکلیفیں اور بیماریاں پہلے بھی انسانوں کو لاحق تھیں اور آج بھی ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے حقوق پر پہلے بھی ڈاکے ڈالتا تھا اور آج بھی اس تہذیب وتمدن کے روشن دور میں بھی یہ ڈاکہ زنی عام ہے۔ جھوٹ، مکر وفریب، وعدہ خلافی و بدعہدی جیسے اوصاف رذیلہ اُس زمانے میں بھی انسان کے لیے مضر تھے جب وہ اونٹوں اور گدھوں پر سواری کرتا تھا اور آج بھی جب کہ وہ کاروں اور جیٹ طیاروں میں سفر کرتا ہے ان کی مضرت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ظلم وجور، انسانوں کا انسانوں کے ہاتھوں استحصال پتھر کے زمانے میں بھی ہوتا تھا اور آج جب ایٹم کا دور ہے استبداد واستحصال پر مبنی کارروائیاں جوں کی توں ہیں۔ خدا کے خوف سے عاری لوگوں اور انبیاء ورسل کی تعلیمات سے انحراف کرنے والوں کی پہلے بھی کمی نہ تھی اور آج بھی کمی نہیں۔ مرد وعورت اور فرد ومعاشرہ کے تعلقات میں عالم انسانی افراط وتفریط کا پہلے بھی شکار رہا ہے اور آج بھی شکار ہے۔ پس جب زندگی کے مسائل اپنی حقیقت کے اعتبار سے پرانے ہی ہیں تو کیا مضائقہ ہے اگر ان کا علاج بھی وہی اختیار کر لیا جائے جو صدیوں سے شافی ثابت ہو رہا ہے۔ یعنی اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَ مَلٰئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔

صفتِ ایمان سے متصف افراد ہی درحقیقت اصلاح یافتہ افراد ہوتے ہیں جن سے صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے اور صالح معاشرہ ہی اصلاحِ افراد کا بھی ضامن ہوتا ہے۔ اس طرح ایمان، افرادِ معاشرہ کو بیک وقت صالح ومصلح حیثیت دے کر معاشرتی زندگی کے اردگرد ایک زبردست حصار قائم کر دیتا ہے جو اس میں سے ایمان واصلاح کے عنصر کو کبھی خارج نہیں ہونے دیتا۔

اِن گزارشات کا ماحصل یہ ہے کہ نوعِ بشری کے لیے واحد اور منفرد راہ نجات راہ ایمان ہی ہے۔ مسلمانوں کے لیے تو اس کی حیثیت رگ جان سے بھی زیادہ ہے۔ اسی راہ پر چل کر وہ اپنے مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی امنگوں اور ارمانوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ انہیں آخرت مطلوب ہو تو ایمان کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔ دنیا مطلوب ہو تو اس کے حصول کا راستہ بھی یہی ہے۔ دونوں کی طلب ہو تو ایمان اس کی بھی ضمانت دے سکتا ہے۔ جہاں تک ایمان کے ذریعے اخروی سعادت کے حصول کا تعلق ہے اس امر کی وضاحت ہم کسی دوسرے موقع پر اُٹھا رکھتے ہیں۔

ضبط و نظم پیدا ہو اور انسان بہتر اور شادکام زندگی گزارنے کے قابل ہو۔

اور ایمان سے ہماری مراد دینِ اسلام کا پیش کردہ ایمان ہے، قرآن و سنّت کا ایمان اور صحابہ و تابعین کا ایمان جو عرفانِ الٰہی، حُسنِ نیت و اعتقاد اور عمل صالح سے عبارت ہے۔ وہ عقلی ایمان نہیں جو متکلمین کے ہاں ملتا ہے۔ نہ وہ روحانی ایمان جو اہل تصوف کا خاصہ اور نہ وہ خشک ظاہریت پہ مبنی ایمان جو جمود پرست فقہاء کے ہاں پایا جاتا ہے۔

ہمارا مطلوبہ ایمان محض ایک شعار اور دعوت ہی نہیں بلکہ وہ ایک مکمل اسلوب حیات ہے، فرد کے لیے بھی اور قوم کے لیے بھی۔ نہایت تیز روشنی ہے جو فرد کی دنیائے فکر و ارادہ کو منور کرتی ہے اور جب اس کی شعاعیں معاشرہ پہ پڑتی ہیں تو اس کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑنے لگتا ہے۔ اس کے رگ و پے میں امن و عافیت سرایت کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ مریض ہوتا ہے اور دوائے ایمان اسے شفایاب کر دیتی ہے بلکہ وہ مرچکا ہوتا ہے اور اکسیر ایمان اُسے حیاتِ نو بخش دیتی ہے۔ سچ ہے کہ ایمان رموزِ الٰہی کا راز دان ہوتا ہے وہ جب کسی چیز کو کہتا ہے ہو تو وہ وجود میں آجاتی ہے۔

حقیقی ایمان پوری زندگی پر اپنے نقوش و اثرات مترتب کرتا ہے اور اسے صبغۃ اللہ میں رنگ دیتا ہے۔ انسان کے افکار و نظریات، اس کے جذبات و اطوار سب اطاعت الٰہی اور بندگیٔ رب کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا جس پہ یہ رنگ گہرا نہ ہو۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃً۔

وہ قوم جو ایمان سے منور زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اسے اپنے جملہ اصول و مناہج تقاضائے ایمان کے مطابق بدلنا ہوں گے اور ہر اس چیز سے دست کش ہونا پڑے گا جو نور ایمان کا راستہ روکنے والی ہو۔ اگر کوئی قوم یہ قربانی نہیں دیتی مگر اسلام و ایمان کا دعویٰ کرتی چلی جاتی ہے تو اس کے اِس دعوٰی کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ دعوٰی بلا دلیل ہے۔

اے اللہ امتِ مسلمہ کی صراطِ ایمان کی طرف رہنمائی فرما۔ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین ۔ آمین ــــ اِلٰہَ الحق آمین ۔

قادیانی مسئلہ اور اس کا صحیح حل

ابوالاعلیٰ مودودی

گذشتہ ماہ مئی کے حادثۂ ربوہ پر مسلمانوں میں جو ردعمل واقع ہوا اور غلام احمدی اُمت کو اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے الگ کرنے کے لیے پاکستان کے تمام مسلمانوں نے کامل اتحاد و اتفاق کے ساتھ جو جدوجہد شروع کی وہ اگرچہ بالکل ایک فطری امر ہے، مگر میں اس کو بروقت نہیں بلکہ بہت بعد از وقت سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یہ ردعمل اُس وقت رونما ہوا ہے جب مسلم معاشرے کے اندر اس فتنے کو پرورش پاتے اور پروان چڑھتے ۸۰۔۹۰ سال بیت چکے ہیں، اور اب اس کے استیصال کے لیے یہ آخری موقع ہمیں ملا ہے جس کو اگر ہم نے کھو دیا تو کچھ بعید نہیں کہ یہ فتنہ ہمیں لے ڈوبے گا۔ لا قدّرہا اللہ۔

درحقیقت اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ بہت بڑی بات ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی شخص حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کھلم کھلا نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھے اور اس کی دعوتِ باطل کو اسی مسلم معاشرے میں پھیلنے کا موقع حاصل ہوتا چلا جائے۔ یہ اتنا بڑا گناہِ عظیم ہے کہ اسے ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہ کیا جانا چاہیے تھا، کجا کہ اس کے معاملہ میں اس قدر تساہل برتا جاتا کہ وہ صدی کی آٹھ نو دہائیوں تک نہ صرف ہمارے ملک میں، بلکہ دوسرے مسلم اور غیر مسلم ملکوں میں بھی پھیلتا چلا جاتا۔ اس معاملہ میں ہم اُس دور کے لیے تو اللہ جل شانہٗ کے سامنے کچھ عذر پیش بھی کر سکتے ہیں جبکہ ہم پر انگریزی حکومت مسلّط تھی، اور ہم اُس کے آگے بے بس تھے، اور وہ اِس فتنے کی آبیاری کر رہی تھی۔ لیکن انگریزوں سے آزاد ہونے کے بعد جب پاکستان کا اقتدار خود مسلمانوں کے ہاتھ میں آگیا۔ اُس وقت ۲۷ سال تک اس فتنے کی آبیاری خود انگریزوں سے بھی بڑھ کر ہمارے مسلمان حکمرانوں

کے ہاتھوں ہونا، اور اس کو اتنی طاقت پکڑ جانے کا موقع دینا کہ وہ پاکستان کی حکومت پر قابض ہو جانے کا حوصلہ کرنے لگے، ایسا اکبر الکبائر ہے جس پر کوئی عذر ہم اپنے رب کے حضور پیش نہیں کر سکتے۔ اب اگر ہم اسی پچھلے طرزِ عمل کو جاری رکھتے ہیں تو خدا کے عذاب سے ہمیں کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس لیے میں عام مسلمانوں سے بھی کہتا ہوں کہ جو تحریک انہوں نے اِس فتنۂ غلام احمدیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے شروع کی ہے اسے ایک قطعی فیصلے تک پہنچائے بغیر ہرگز نہ چھوڑیں، اور ملک کی حکومت اور قومی اسمبلی سے بھی کہتا ہوں کہ وہ خدا کے حضور اپنی جواب دہی کو یاد کریں، سیاسی اغراض و مصالح کو بھول جائیں اور پوری ایمانداری کے ساتھ وہ فیصلہ کریں جو عین ان کے دین و ایمان کے مطابق ہے۔

یہ معاملہ جو اس وقت اسمبلی میں زیرِ بحث ہے، اپنے اندر کوئی پیچیدگی نہیں رکھتا، بلکہ کھلے آسمان کی طرح صاف اور عیاں ہے۔ جس شخص کو دین کی معمولی واقفیت بھی حاصل ہو وہ جانتا ہے کہ اسلام میں نبوت ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اگر نبی سچا ہو اور کوئی اس کو نہ مانے تو کافر۔ اور اگر وہ جھوٹا ہو اور کوئی اسے مان لے تو کافر۔ بہرحال ایک دعوائے نبوت کے بعد یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ اُس کے ماننے والے اور اُس کا انکار کرنے والے ایک اُمّت میں جمع ہو سکیں۔ نبوت ایک سنگین دیوار ہے جو دونوں گروہوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے حائل ہو جاتی ہے اور انہیں ملنے نہیں دیتی جب تک کہ وہ منہدم نہ ہو جائے۔ ہر نبوت اپنے ماننے والوں کی ایک الگ اُمّت بناتی ہے اور نہ ماننے والوں کو قطعی طور پر ان سے جدا کر دیتی ہے۔

یہ تو ہے بجائے خود نبوت کی اُصولی حیثیت۔ لیکن اسلام میں اِس امر کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوّت کا دعوٰی لے کر اُٹھنے والا کوئی شخص سچا نبی ہو سکے۔ اس لیے کہ قرآنِ حکیم، احادیثِ صحیحہ اور اجماعِ امت کی رو سے حضوّر اللہ کے آخری نبی ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے حضوّر کے بعد نبوت کا دعوٰی کرنے والے کسی شخص سے بھی یہ نہیں پوچھا کہ اس کے نبی ہونے کی دلیل کیا ہے بلکہ بالاتفاق اُس کو جھوٹا مدعی قرار دے کر اُس سے اور اس کے ماننے والوں سے جنگ کی اور اُن کو وہ حقوق بھی نہیں دیے جو اسلامی قانون میں مسلح بغاوت کرنے والے مسلمانوں یا ذمیوں کو دیے جاتے ہیں۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے دَور سے آج تک ۱۴ سو برس کی مدّت میں ہر زمانے کے مسلمان اس بات پر متفق رہے ہیں اور اس میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے کہ بعثتِ محمدیہ علی صاحبہا السلام کے بعد